اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ

از
ڈاکٹر مسعود حسین

ایجوکیشنل بک ہاؤس
علیگڑھ

اُردو زبان کی تاریخ کا خاکہ

(ترمیم شدہ)

از

ڈاکٹر مسعود حسین

ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی (علیگ) ڈی۔ لٹ (پیرس)

ریڈر شعبۂ اُردو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پبلشر

ایجوکیشنل بک ہاؤس

حامد بلڈنگ۔ سول لائن۔ یونیورسٹی ایریا۔ علی گڑھ ۲

(مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی)

قیمت ۱۰/

عنوانات

(۱)

دنیا کی زبانوں میں اُردو کا مقام

دنیا کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ ۹۰۸ سو کے قریب لگایا جاتا ہے۔ ان زبانوں کے ماہرینِ لسانیات نے اُن کو بناوٹ، اور صوتیات کے اعتبار سے بارہ چھوٹے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ زبانوں کی یہ گروہ بندی آخری اور قطعی بات نہیں۔ نئے نئے لسانی انکشافات کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے خاندان ابھی ظہور میں آئیں گے اور زبانوں کا بٹوارا ان کی روشنی میں از سرِ نو ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زبانوں کی یہ تقسیم کتنی ہی نامکمل سہی، ماہرینِ لسانیات کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

دنیا کی زبانوں میں اُردو کے صحیح مقام کو جاننے کے لئے اور اس کے رشتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلانے کے لئے ذیل میں ان خاندانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) **ہندیورپی خاندان**:۔ یہ خاندان اُردو زبان اور لسانیات دونوں کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اُردو زبان کا تعلق براہ راست

اسی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی زبانیں شمالی ہندوستان، افغانستان، ایران اور یورپ کے تقریباً تمام ممالک (انگلستان۔ فرانس جرمنی۔ اٹلی۔ یونان وغیرہ) میں بولی جاتی ہیں سنسکرت۔ پالی۔ قدیم فارسی۔ یونانی۔ لاطینی وغیرہ قدیم زبانیں اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آجکل اسی خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک زبان یعنی انگریزی تمدنِ انسانی کا سب سے زبردست کارنامہ بن گئی ہے۔

(۲) **سامی خاندان**:۔ تہذیب و تمدن کے قدیم گہوارے شام، لبنان وغیرہ کی پرانی زبانوں عبرانی اور سریانی کا تعلق اسی خاندان سے تھا موجودہ عربی انھیں کی جانشین ہے۔ عربی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس خاندان کو فروغ حاصل ہوا اور یورپ و ایشیا کے دور دراز گوشوں میں پھیل گئی، جہاں یہ آج بھی آریائی زبانوں سے گھتھی نظر آتی ہے۔ اکثر آریائی زبانوں (مثلاً فارسی اور اُردو) پر اس کی اتنی گہری چھاپ پڑی ہے کہ اُن کی شکلیں پہچان نہیں پڑتیں۔ اسلامی علوم کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے یہ مذہب کا سہارا لے کر ابھی تک آریائی زبانوں کے علاقوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔

(۳) **تورانی خاندان**:۔ اس خاندان کی زبانیں منگولیا، منچوریا اور سائبیریا کے وسیع میدانوں میں بولی جاتی ہیں۔ ترکی یا تاتاری زبان ان میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ترکوں اور مغلوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کا عروج ہوتا ہے۔ چنانچہ اُردو میں بھی ترکی

الفاظ کا کافی بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

(۴) **دراوڑ خاندان**:۔ اس کی زبانیں جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں تامل تلیگو اور ملیالم اس کی خاص زبانیں ہیں۔ تلیگو کے اکثر الفاظ کتنی اُردو میں پائے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا خاندان السنہ کے علاوہ دوسرے غیر متعلقہ خاندانوں کی فہرست یہ ہے۔

(۵) ہند چینی خاندان (۶) افریقہ کے ہمیٹک بنٹو زبانوں کا خاندان (۷) آسٹریلیا، امریکہ کی بولیوں کے خاندان وغیرہ۔

ہند یورپی خاندان کی مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اس خاندان کی تمام زبانیں کسی ایک قدیم زبان سے نکلی ہوں گی۔ یہ اصل زبان کیا تھی، اس کے بولنے والے کہاں بستے تھے اور وہ کس طرح یورپ و ایشیا کے وسیع بر اعظموں میں پھیلے! آریوں کے متعلق یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ابھی تک اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔ علمی تحقیق میں اختلاف کی کس درجہ گنجائش ہے۔ اس کا اندازہ ان مختلف نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتا ہے جو آریوں کے اصل وطن کے متعلق پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کا سلسلہ ہندوستان (پنجاب و کشمیر) سے شروع ہو کر ہندوکش، تبت، کاکیشیا، وسط ایشیا، جنوبی روس، بحیرہ بالٹک، اسکنڈے نیویا، آسٹریا ہنگری اور سائبریا پر ختم ہوتا ہے۔

آریوں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ جدید ترین تحقیق کے مطابق قرون اولیٰ میں ہند یورپی زبان و تمدن کا گہوارہ جنوبی روس کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف جرمنی اور پولینڈ سے ملتا ہے اور دوسری طرف وسط ایشیا کے سلسلہ ہائے کوہ سے تاریکی دھند لکے ہیں یہ آریا قبائل مغرب اور جنوب مشرق کی طرف پھیلنا شروع ہوتے ہیں۔ جو گروہ مغربی یورپ میں داخل ہوتا ہے وہ مختلف شاخوں میں بٹ کر کل یورپ میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرا گروہ شمالی ایران میں داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ آریوں کو تاریخی روشنی میں ہم سب سے پہلے شمالی مغربی ایران میں (۲۰۰۰ ق م) کے لگ بھگ دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ ۱۵۰۰ ق م مقرر کی جاسکتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ یہ ہند یورپی زبان بولنے والے آریا اپنے داخلہ ہندوستان سے قبل عرصہ تک مشرقی ایران میں قیام کر چکے ہوں گے۔ جہاں ان کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ہند یورپی سے ہند ایرانی منزل پہ پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستان کے زریں خیز میدانوں میں آریوں کا داخلہ کسی منظم سیاسی تحریک کی شکل میں نہیں ہوا۔ اس میں جہاں گیری سے زیادہ جہاں بینائی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں آریوں کا سابقہ دراویڈی قوموں سے پڑا جنھیں زیر کرنے میں انھیں کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس جدوجہد کی جھلک رگ وید

کے منتروں میں پائی جاتی ہے۔ موجودہ ہندی تمدن خالص آریائی
تمدن نہیں کہا جا سکتا۔ فاتح اور مفتوح دونوں آخر میں ایک دوسرے
پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نئے تاریخی انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت
کو پہنچ چکی ہے کہ نو وارد آریوں کا سابقہ ہندوستان میں ایک ایسی
متمدن قوم سے پڑا جو کئی لحاظ سے ان صحرا نوردوں پر فوقیت رکھتی
تھی۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدن کے (اور زبان کے بھی) بیشتر بنیادی
عناصر اسی قدیم تمدن کی یادگار ہیں۔ آریوں نے دراویدی مذہب کی بہت
سی رسومات کو بھی اپنایا۔ بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات (مثلاً
ہنومان جی کا خالص دراویدی ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے لسانی
تحقیق سے یہ حصہ بالکل تاریکی میں ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا
کہ ابتدائی پراکرتوں کی پیدائش دیش کی انھیں بولیوں کی گود میں ہوئی
ہوگی۔ قدیم غیر آریائی تمدن کی سب سے بڑی دین 'براہمی' رسم الخط
ہے، جو آج ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں (اِلّا اردو
اور کشمیری) کا ماخذ ہے اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی
زبانوں کے لئے استعمال کیا ہے۔



(۲)

ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ

(الف) عہد قدیم (۱۵۰۰ تا ۵۰۰ ق م): ویدک زبان، سنسکرت، پہلی پراکرت
آریائی زبان کے ارتقا کا پہلا مستند نقش ہمیں رگ وید (۱۵۰۰ ق م)
کی شکل میں ملتا ہے۔ اس وقت "ہند یورپی" زبان "ہند ایرانی" منزل سے
گذر کر خالص "ہند آریائی" شکل اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ مشرقی ایران
سے لے کر ہندوستان تک اس لسانی ارتقا کی نشان دہی کی جا سکتی
ہے۔ رگ وید کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف زمانوں اور مختلف
مقاموں پر ہوئی ہے۔ اس کے کچھ اشلوک قندھار (گندھار) میں
لکھے گئے۔ کچھ دریائے سندھ کے کنارے اور کچھ جمنا کی وادی میں۔
اس میں شک نہیں کہ آریا ابھی دریائے سندھ تک ہی پہونچ پائے
تھے کہ ان کی زبان نے ادبی شکل اختیار کر لی تھی لیکن 'رگ وید' کے
بیشتر اشلوک اسی غیر مصنوعی اور سادہ زبان میں ہیں جو اس وقت
آریوں کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ دریائے سندھ سے آریہ جوں جوں
آگے بڑھے اُن کی زبان پر صوبجاتی اور دیسی بولیوں (کول، دراویدی
آسٹرک وغیرہ) کا بھی اثر پڑا۔ یہ اثر صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ دیسی الفاظ
کا میل بھی ہونے لگا تھا۔ مثلاً ذیل کے الفاظ 'کال (وقت)، 'گند'،
نیلا'، پوجا'، پھل'، بل'، بیج'، مور'، رات'، روپ وغیرہ ہندوستان کی دیسی

بولیوں کے لفظ ہیں۔ رفتہ رفتہ ملک کے دور دراز حصوں میں پھیلنے اور غیر آریہ اقوام سے ربط و ضبط بڑھنے کی وجہ سے آریوں کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ تلفظ اور الفاظ کے استعمال کا فرق ناگزیر ہوگیا۔ بعض جگہ الفاظ کو اجنبی ماحول کی صوتیات سے متاثر ہوکر توڑ مروڑ دیا جاتا تھا۔ مشرقی ہندوستان میں غیر آریہ اقوام کی کثرت کی وجہ سے یہ لسانی تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں ۱۰۰۰ ق۔م سے ۶۰۰ ق۔م تک آریہ شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اس عہد کی زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل انداز میں کی جاسکتی ہے۔

(۱) اُدیچیہ: (شمال مغربی ہندوستان کی زبان)
(۲) مدھ دیشیہ: (مدھ دیش انبالہ سے الہ آباد تک کی زبان)
(۳) پراچیہ: (مشرقی ہندوستان بنگال بہار وغیرہ کی زبان)۔

شمال مغربی ہندوستان کی زبان کو اس زمانے میں اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان سے زیادہ قریب تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں یہی زبان زیادہ صحیح اور کھری سمجھی جاتی تھی۔ مشرقی ہندوستان کے رہنے والوں کو شمال مغربی ہندوستان کے آریہ حقارت کی نظر سے

دیکھتے تھے اور اُن کو بھوت پریت کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی زبان کو 'اشدھ' کہا گیا ہے۔ اس میں "ر" کی آواز "ل" میں تبدیل ہوجاتی تھی جیسا کہ موجودہ بہاری بولی میں بھی پایا جاتا ہے کہ 'راجا' کا 'لاجا' اور 'کھیر' کا 'کھیل' ہوجاتا ہے۔ مدھ دیش (دوآبہ) کی زبان کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں۔ یہاں کی زبان نہ تو پنجاب کی بولی کی طرح معیاری سمجھی جاتی اور نہ اس قدر ذلیل و پست جتنی کہ پورب کی بولی۔ بلکہ جوں جوں آریائی تہذیب کا مرکز پنجاب سے ہٹ کر دوآبہ میں ہوتا گیا۔ یہاں کی زبان کو بھی ممتاز حیثیت دی جانے لگی۔

اسی زمانے میں آریائی زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ صوبجاتی اور مقامی تعصبات سے الگ ہٹ کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا جو سب جگہ رائج ہوں۔ سب لوگ ادب میں ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے۔ اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (شدھ) ہوگئی۔ جو درجہ آجکل ہندوستانی کو حاصل ہے یا جو عہد پراکرت میں مہاراشٹری کو حاصل ہوا۔ وہی درجہ اس زمانے میں سنسکرت کو حاصل تھا۔ ملک کے جن جن حصوں میں آریہ پھیل گئے تھے وہاں کے مذہبی اور علمی طبقوں میں یہ سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں یہ وحدت کا کام دیتی تھی۔

رفتہ رفتہ سنسکرت کا رواج بھی کم ہونے لگا۔ اس کے کئی سبب تھے۔ پہلا یہ کہ اس نے مذہب کو اپنے آغوش میں جگہ دی۔ اس لئے برہمنوں کے حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ دوسرا یہ کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ہر زبان کا مقدر یہی ہے کہ وہ تھوڑے عرصہ میں خواص کی زبان بن جائے۔ لیکن اس کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جس کے علمبردار مہابیر جین اور مہاتما گوتم بدھ تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے مذہبوں کی تلقین، اپنے یہاں کی مقامی بولیوں میں کی۔ عوام نے اس کا استقبال کیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبجاتی بولیاں چمک اٹھیں اور سنسکرت سے ٹکر لینے لگیں۔ اس کے رد عمل کے طور پر ویدک مذہب کے علمبردار اپنی زبان کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔ سنسکرت کے زوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور بے لوچ نہیں تھی جتنی کہ سنسکرت۔ اپنی اہمیت کی وجہ سے اس نے دیو بانی (الہٰی زبان) اور امر بانی کا مرتبہ تو پایا لیکن یہ "امرپن" اس کے لئے بار بن گیا۔ ادھر اس کی دوسری بہن (پراکرت) جو رانی بن کر عوام کی گود میں پلی جس نے آریوں کے علاوہ غیر آریوں کو بھی سمیٹا، مروجہ زبان کی ماں بن بیٹھی۔ استعارہ

میں یہی بات یوں کہی جائے گی کہ زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے۔ اس کی ایک شاخ جھیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے، حسین لیکن محدود، جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں جس کے ارد گرد اس کی گرامر کے سنگین ساحل پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف روپ بدلتی ہوئی اب تک بہہ رہی ہے کبھی گدلی کبھی تابناک لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق براہ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے۔ مختصر یہ کہ آریوں کی ابتدائی زبان (جو کہ دیسی بولیوں کے میل سے بنی تھی) ہی سے ویدک زبان اور سنسکرت پیدا ہوئیں۔ اور دوسری صوبجاتی بولیاں یعنی پراکرتیں بھی پھوٹیں۔ سنسکرت نے صرف چنے ہوئے شائستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا۔ لیکن صوبجاتی بولیوں نے ویدک زبان کے فطری رجحان کو اپنایا۔ یہی اُن کے پراکرت (فطری) کہلانے کا سبب ہے۔ اس طرح ویدک زبان اور پراکرتوں میں سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ قریب کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔

انھیں پہلی پراکرتوں کی ادبی شکل کو پالی کا نام دیا گیا ہے پالی کے نمونے یا تو بدھوں کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں یا پھر اشوک کی لاٹوں پر جو جنوب میں گنجم کے مقام سے لے کر یوسف زئی کے علاقہ میں شہباز گڑھی تک پائی جاتی ہیں۔ ان لاٹوں کی

تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ اشوک کے زمانہ میں کم از کم دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک مشرقی اور دوسری مغربی۔ مغربی پراکرت پر سنسکرت کا اثر گہرا نظر آتا ہے۔ اس کی نمایاں شکل شورسینی پراکرت تھی۔ مشرقی پراکرت، ماگدھی کہلاتی تھی، اس زمانے تک کسی ایسی پراکرت کا پتہ نہیں ملتا جسے دکھنی پراکرت کہا جا سکے۔

(ب) عہد وسطیٰ (۵۰۰ ق۔م تا ۶۰۰ء) دوسری یا ادبی پراکرتیں

اس عہد میں لسانی ارتقا کی دو نمایاں شکلیں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف تو سنسکرت جو اعتبار صوتیات اور صوریات ابھی تک قدیم آریائی زبانوں سے رشتہ جوڑے ہوئے تھی۔ لیکن جس کی نحو اور فرہنگ سے روح عصر بھی جھلکتی تھی علمی اور ادبی طبقوں پر دھاک جما رہی تھی اور دوسری طرف بدھ اور جین متوں کا سہارا لے کر عوام کی بولیاں تیزی کے ساتھ ادبی پراکرتوں کی شکلیں اختیار کر رہی تھیں۔ ان پراکرتوں کے ابتدائی حالات کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ البتہ پالی ہی کے اندر اُن کے درشن دکھائی دیتے ہیں۔ اس عہد کی ادبی پراکرت کی پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں۔

(۱) مہاراشٹری:۔ ادبی حیثیت سے اس زمانے میں اس پراکرت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اس عہد کا بیشتر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ عہد پراکرت کے قواعد نویسوں نے

اسے نمونہ مانا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کی رو سے مہاراشٹری پراکرت کو ملک دکن سے کوئی نسبت نہیں بلکہ یہ شورسینی پراکرت کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

(۲) **شورسینی**:۔ اس کا مرکز شورسین دیس (دوآبہ کا وسطی حصہ متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقہ میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا وہ یہی تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی اس کی جھٹ پٹی جھلک ملتی ہے۔ دراصل دوآبہ کے علاقہ میں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں۔ اسی لئے دونوں میں نہایت گہرا رشتہ نظر آتا ہے۔ سنہ ۱ء سے پہلے ہی اس نے مسلّم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

(۳) **ماگدھی**:۔ مگدھ دیس (جنوبی بہار) کی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ آریائی تہذیب و تمدن کے مرکزوں سے دور جا پڑی تھی، اسلئے ایک غیر مہذب زبان سمجھی جاتی تھی بعض مصنفوں نے اس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام (ماگدھی) سب سے پہلے سیلون کے بدھوں میں پڑا تھا جو ہندوستانی لسانیات کے نازک اختلافات سے قطعاً ناواقف تھے۔

(۴) اردھ ماگدھی:۔ شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی

علاقے کی زبان اس نام سے مشہور تھی۔ آج اسی علاقے کو دلی والے 'پورب' کے نام سے پکارتے ہیں۔ گوتم بدھ اور مہابیر جین دونوں نے اسی پراکرت کو اپنایا تھا۔ اس کا رواج اس زمانے میں شاہی خاندان تک میں تھا۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ تاریخ سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ دوآبہ کے رہنے والوں کو اس کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس وقت کی معیاری زبان تھی۔

(۵) **پشاچی**:- (پشاچ۔ کچا گوشت کھانے والے) یہ پنجاب اور کشمیر کے علاقہ کی پراکرت تھی۔ یہ اتنے دھندلکے میں تھی کہ عوام میں بھوت پریت کی زبان سمجھی جاتی تھی یہ عہد قدیم کے قواعد نویس ورروچی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ گریرسن نے بھی رام شرما کی تحریروں کے اس حصے پر کافی زور دیا ہے، جس میں پشاچی کا ذکر ہے۔ کشنوں کے عہد (ان ۷۸ تا ۲۰۰ء) شمال مغرب ہندوستان کی اس پراکرت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس زمانے میں شاہی سرپرستی کے تحت 'گندھار' کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے اس علاقے میں رائج ہو گئی تھی اور ٹکسلا کا دارالعلوم اس وقت سارے ہندوستان کے لئے علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔

(ج) عہدِ جدید ۱۰۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء) اپ بھرنش اور جدید آریائی زبانیں

لسانیات کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے، ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی زبانوں کی شکل اختیار کرنی شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں، اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔ اسی بول چال کی زبان کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے "اپ بھرنش" (یعنی بگڑی زبان) کہا ہے۔ یہ چھٹی صدی عیسوی میں تحریری کاموں میں آنے لگی تھی۔ اپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی سے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے حالانکہ گیارھویں صدی عیسوی ہی سے جدید آریائی زبانوں کا طلوع سمجھنا چاہیے۔

شروع شروع میں لفظ اپ بھرنش کسی خاص زبان کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ اَن پڑھوں کی زبان کو اپ بھرنش یا اپ بھاشا کہا کرتے تھے۔ آریہ لوگ اپنی زبان کے معاملے میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ سنسکرت میں "ملیچھ" اپ بھرنش لفظ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ گھن اور نفرت کا مفہوم بعد کو پیدا ہوا۔ اپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پاکر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ یورپ کی زبانوں تک نے

اس کے اثر کو قبول کیا۔ لیکن گجرات، راجپوتانہ اور دوآبہ میں بولی جانے والی زبانوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں دوآبہ کی شورسینی اپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی۔ اس کا بڑا سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا۔ جن کا مرکز اس وقت گنگا کی ترائی میں شہر قنوج تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے جینیوں نے بھی اس کو بڑی ترقی دی۔ اس وقت اپ بھرنش کی تین نمایاں قسمیں تھیں۔

(۱) **ناگر اپ بھرنش**:۔ جو گجراتی اور راجستھانی کی قدیم بولیوں سے نکلی تھی۔ لیکن جس پر شورسینی کا اس قدر گہرا اثر پڑا تھا کہ وہ اس کی شاخ معلوم ہوتی تھی۔ اس اپ بھرنش کو خاص اہمیت یوں حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی۔ ہندی رسم الخط کا نام ناگری اسی کی رعایت سے پڑا ہے۔ خود اس کا "ناگر" نام گجرات کے ناگر برہمنوں کی نسبت سے پڑا۔

(۲) **براچڈ**:۔ یہ سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی زبان اسی سے نکلی ہے۔

(۳) **اپ ناگر**:۔ یہ ناگر اور براچڈ کے میل سے بنی تھی اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور دکھنی پنجاب میں تھا۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ اپ بھرنش کی اتنی ہی قسمیں تھیں جتنی کہ پراکرت کی، لیکن ان کے نمونے نہیں ملتے۔

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ پورب میں اشوک کے بعد وہاں کی زبان نے بالکل ترقی نہیں کی۔ کم از کم ماگدھی پر تو تاریخی سایہ آہی جاتا ہے۔ یہ ایک نیچ زبان سمجھی جانے لگی تھی۔ اردھ ماگدھی اور ماگدھی دونوں کے علاقے میں شورسینی ہی ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس زمانے میں پورب کے شاعر اپنی زبان کو تج کر شورسینی اَپ بھرنش ہی میں شاعری کرتے تھے۔ یہ سلسلہ دنوں تک قایم رہا۔ دسویں سے تیرھویں صدی تک کی پُرانی بنگلہ شاعری میں بھی شورسینی کا اثر جھلکتا ہے۔ بہار کے مشہور شاعر وِدّیاپتی نے اپنی زبان میتھلی کے ساتھ ساتھ اوہٹ میں بھی شاعری کی ہے۔ یہ "اوہٹ" شورسینی اپ بھرنش ہی کا ترقی یافتہ روپ تھا۔ ادھر برج بھاشا کو بھی اسی اپ بھرنش کی وراثت ملی تھی، جسے اب کھڑی بولی چھین رہی ہے۔ اس طرح شورسینی اَپ بھرنش اس وقت لنگوا فرینکا کی حیثیت رکھتی تھی اور گجرات و پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔

رفتہ رفتہ یہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر رہ گئی۔ اپنے آخر دور میں (سنہ ۱۰۰۰ء) یہ بہت کچھ موجودہ بولیوں کے قدیم روپ سے ملتی جلتی ہے۔ صحیح صحیح یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ اپ بھرنش کس سنہ میں ختم ہوتی ہے اور جدید بولیاں کب طلوع ہوتی

ہیں۔ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے اور چپ چاپ کے رونما ہوتی ہیں۔ صرف اندازاً کہا جاسکتا ہے کہ جدید آریائی زبانوں کا طلوع ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے سیاسی اُلٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ مسلمان بجلی کی طرح آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ ان کے جلو میں ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان آرہی تھی۔ جس نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ان بولیوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔ دراصل ہندوستان کا لسانی نقشہ سیاسی الٹ پھیر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ مسلمانوں کی فتوحات ہی کے طفیل میں آج دوآبہ کی ایک چھوٹی سی بولی ہندوستان کی لنگوا فرینکا بنی ہوئی ہے۔

(۳)

ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی

ہارنل کے اس مفروضہ کی بنا پر کہ آریہ قبائل ہندوستان میں دو مختلف گروہوں میں داخل ہوئے تھے۔ گریرسن نے ہندوستان کی آریائی زبانوں کو دو شاخوں میں تقسیم کیا ہے ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔ اندرونی شاخ سے تعلق رکھنے والی زبانیں ٹھیک اس علاقہ میں بولی جاتی تھیں جس کا ذکر ہم 'مدھ دیش' کے نام سے کرتے آئے ہیں۔ بیرونی

زبانوں کا سلسلہ نصف دائرے کی شکل میں مغربی پنجاب سے شروع ہو کر سندھ، مہاراشٹر، وسطی ہندوستان، اڑیسہ بہار اور بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلہ کی کڑی صرف گجرات میں ٹوٹتی ہے۔ جہاں کی زبان متھرا والوں کے سیاسی اقتدار کی بنا پر شورسینی سے حد درجہ متاثر نظر آتی ہے۔ گریرسن نے اپنی اس تقسیم کو لسانی دلائل کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بارے میں بغیر تفصیلی جائزہ لئے ہم ڈاکٹر چٹرجی کی اس رائے سے متفق ہیں کہ "جدید آریائی زبانوں کی اندرونی اور بیرونی شاخوں میں تقسیم، لسانی اعتبار سے اس قدر مہمل ہے جتنی کہ تاریخی اعتبار سے۔" جدید تحقیق کی روشنی میں ان زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل طریقے پر کی جا سکتی ہے۔

(الف) شمالی: (۱) سندھی (۲) لہندا (۳) پنجابی

(ب) مغربی: (۴) گجراتی (۵) راجستھانی

(ج) درمیانی: (۶) مغربی ہندی

(د) مشرقی: (۷) مشرقی ہندی (۸) بہاری (۹) اڑیا (۱۰) بنگالی (۱۱) آسامی

(ہ) جنوبی: (۱۲) مرہٹی

ان کے علاوہ پہاڑی علاقے کی زبانیں بھی ہیں۔ جو راجستھانی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔

اِن زبانوں میں سے اُردو کا تعلق براہِ راست مغربی ہندی سے ہے جس کی پانچ بولیاں ہیں:۔

(۱) ہندوستانی (کھڑی بولی)

(۲) برج بھاشا

(۳) بندیلی

(۴) ہریانی یا بانگڑو

(۵) قنوجی

قنوجی دراصل برج بھاشا ہی کی ایک شکل ہے۔ ان بولیوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ شورسینی پراکرت اور شورسینی اَپ بھرنش کی سچی جانشین تھی۔ اس کا مرکز متھرا ہے۔ جنوب میں یہ آگرہ، بھرت پور، دھول پور، گوالیار اور جے پور تک بولی جاتی ہے۔ شمال اور شمال مشرق میں ضلع گوڑگاؤں، علی گڑھ، بلند شہر، ایٹہ، مین پوری، بدایوں، بریلی اور نینی تال کے ترائی پرگنوں تک یہ رائج ہے۔ اُردو ہندی سے قبل یہ اس علاقے کی مانی ہوئی ادبی زبان تھی۔ شاید اسی وجہ سے آزاد نے اُردو زبان کا رشتہ برج سے ملایا ہے۔

جمنا کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی پنجاب میں ہریانی یا بانگڑو بولی بولی جاتی ہے۔ اس زبان کے متعلق تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔ حالانکہ قدیم اُردو کے بنانے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ

تھا۔ دکنی زبان کی وہ خصوصیات جن کی توضیح پروفیسر شیرانی نے پنجابی سے کی ہے کافی حد تک اس بولی سے بھی کی جا سکتی ہے۔

مغربی ہندی کی وہ بولی جو مغربی روہیلکھنڈ، دوآبہ اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی ہے، عرف عام میں کھڑی بولی کے نام سے مشہور ہے۔ گریرسن نے سب سے پہلے اس بولی کو ہندوستانی کا نام دیا ہے۔ اور بولی ہندوستانی اور ادبی ہندوستانی (اُردو) میں امتیاز کیا ہے۔ اُردو اپنے ڈول اور کینڈے کے اعتبار سے مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کی بہ نسبت اس سے زیادہ قریب ہے۔ چنانچہ یہ متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اُردو اس بولی سے نکلی ہے جو مذکورہ بالا علاقہ میں قدیم زمانے سے بولی جاتی ہے اور جو کئی لحاظ سے ایک طرف پنجابی سے مختلف ہے تو دوسری طرف برج بھاشا سے، جس کے ارتقا میں مختلف زمانوں میں مختلف بولیوں نے حصہ لیا ہے۔ لیکن جس کے مستقل وجود کی نشان دہی قدیم زمانے سے کی جا سکتی ہے۔

---

(۴)

ہندوستانی (اُردو) زبان کا عہد بعہد ارتقا

مغربی ہندی (اور اس کی بولیوں کھڑی، برج وغیرہ) کی قدامت کا سب سے بڑا ثبوت وہ قدیم لسانی شہادتیں ہیں جو ہمیں مسلمانوں کی فتح دہلی سے فوراً قبل یا بعد کے نمونوں میں ملتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں نہایت ذہانت سے چند کوی اور خسرو کی تصانیف پر تردیدی قلم اٹھایا ہے اور اس طرح اپنے دعوے کو مستحکم بنانے کی کوشش کی ہے۔ کھڑی بولی یا اُردو (بلکہ ہریانی بھی) اُن کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے داخلہ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں، اور ایک طرح سے وہ مسلمانوں کے اس قافلہ کی مرہونِ منت ہیں جو لاہور سے دہلی ہجرت کرتا ہے۔

کھڑی بولی کی قدامت کو پھر سے قایم کرنے کے لئے ہم ہندی ادبیات سے بعض ایسے نمونے پیش کریں گے جو مسلمانوں کے داخلہ دہلی سے پہلے کے ہیں۔ دراصل مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کی شکلیں ہمیں اپ بھرنش کے ادبی نمونوں تک میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اپنے اشعار کو عام فہم بنانے کے لئے شاعروں کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ وہ شاعری کی قدیم روایات

کو ملحوظ رکھتے ہوئے مروجہ زبان کا پٹ اپنی زبان میں لے آتے ہیں۔ اپ بھرنش عہد میں دیوسینن نام کا ایک جین مصنف ہوا۔ اُس نے جو دوہے نقل کئے ان میں حسب ذیل الفاظ بلاتکلف استعمال ہوتے ہیں:۔

جو۔جن۔بھاشیو (کہنا)۔ لو۔کہیو۔کری۔ پاوی۔ پارو (پار)

اسی زمانے میں بدھ دھرم اپنی بگڑی ہوئی شکل میں ملک کے مشرقی حصّوں میں عرصے سے پھیلا ہوا تھا۔ بہار میں نالندا کی مشہور درسگاہ بدھ سدھوں کا اڈّا تھا۔ بختیار خلجی نے جب ان مقاموں کو اُجاڑا تو یہ تتر بتر ہو گئے۔ ان بدھ سدھوں نے عوام پر اپنا اثر قایم رکھنے کے لئے سنسکرت کی تصانیف کے ساتھ ساتھ اَپ بھرنش ملی ہوئی "دیس بھاشا" میں بھی دوہے لکھے ہیں۔ ان میں سب سے پُرانے "سرہ" ہیں۔ جن کا زمانہ ۸ء کا ابتدائی عہد ہے۔ انھوں نے زبان کی حسب ذیل صورتیں اپنے دوہوں میں استعمال کی ہیں:۔

"نہ۔ ناہیں۔ کہیا۔ اندھارے۔ ڈری آ فعل کہیا" کا خاتمہ "آ" پر ہے۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف پنجابی زبان کی خصوصیت نہیں جیسا کہ شیرانی نے زور دیا ہے بلکہ اس زمانے کی مروجہ زبان ہے کہیا اور کہیو دونوں شکلیں رائج تھیں۔ برنج بھاشا

نے کھیو کی شکل کو اپنایا اور کھڑی اور ہریانی نے "آ" کی شکل اختیار کرلی۔

"آ" آواز کی مزید مثالیں سِدھ "گوی پا" کے یہاں ذیل کے الفاظ میں ملتی ہیں۔ ایک شعر میں۔ کری آ۔ پوچھیا کی ترکیبیں ملتی ہیں جو قدیم دکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔

سِدھ "بروپا" کے یہاں بھی "دیکھ اپا" ملتا ہے۔ دیگر سدھوں کی تحریروں میں جو۔ سو۔ ماریا۔ جا۔ جاب (جب) تاب (تب) کوئی وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں۔

ہیم چندر جو کہ اسی عہد کے مشہور گجراتی جین عالم تھے، اپنی قواعد میں ایک دوہا دیتے ہیں جس کا پہلا مصرعہ حسب ذیل ہے ؎

بھلا ہوا جو ماریا بہنی ہمارا کنت (بھلا ہوا جو مارا گیا اے بہن ہمارا پیارا)

اَپ بھرنش کے عہد کے دوسرے نامور شاعر سوری۔ ودیا دھر اور شارنگ ہیں۔ جن کے یہاں ذیل کے الفاظ بے تکلف ملتے ہیں:۔

بجّیا (بھاگا) لگیا۔ چلیا۔

اَپ بھرنش عہد کے بعد ہندی ادب کا وہ دور آتا ہے جسے "ویر گاتھا" کہا جاتا ہے۔ "پرتھوی راج راسو" جسے شیرانی جعلی کتاب بتاتے ہیں، اسی عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ "راسو" کے

متعلق تفصیلی بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اس قدر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ راسو کے بعض حصّے اتنے ہی قدیم ہیں جتنا کہ کہا جاتا ہے۔ راسو کے اس حصّے میں بھی کھڑی بولی کی شکلیں نظر آجاتی ہیں۔ اس میں عربی اور فارسی کے یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:-

سوار۔ شہنائی۔ عربی۔ ترکی اور کمان

جنھیں اَپ بھرنش یا قدیم زبان کے صوتی اصولوں کے مطابق۔

اسوار۔ سَہنائی۔ عربی۔ ترکی اور کمان لکھا گیا ہے۔

خسرو۔ پرتھوی راج کے قتل کے نوّے برس بعد خسرو نے شاعری شروع کی۔ جو نہایت صاف اور سادہ اُردو میں ہے۔ یوں صدی کے اندر پنجابی مسلمانوں کے زیر اثر دلّی اور اس کے آس پاس ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا ایک حیرت انگیز کرشمہ کہلائے گا۔ دراصل برج اور کھڑی کی جن شکلوں کو ہم اَپ بھرنش میں دیکھ آئے ہیں اس کا پورا نکھار خسرو کے یہاں ہو جاتا ہے۔ راسو اور خسرو کے درمیان فارسی رسم الخط میں ادب کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ ہندی رسم الخط میں جو نمونے ملتے ہیں وہ برج کی ابتدائی شکل کا پتہ دیتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں کی دھاریں قدیم زمانے سے یہ رہی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اَپ بھرنش

کی شاعری کا ڈھانچہ جب بگڑنا شروع ہوتا ہے تو برج یا پنگل کی شکل لے لیتا ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خسرو نے بحیثیت ایک ماہر لسانیات کے زبان کا سب سے چلتا ہوا روپ اپنی پہلیوں اور مکرنیوں کے لئے منتخب کیا ہوگا۔ یعنی وہ زبان جو عام طور سے اس وقت دلّی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھی: لیکن چونکہ اس وقت دلّی اور اس کے نواح میں برج ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس لئے خسرو ہمیشہ خالص کھڑی میں نہ لکھ سکے۔ بلکہ اکثر اوقات انھوں نے شاعری کی معیاری زبان یعنی برج سے متاثر ہو کر اپنی زبان کو ملواں بنا دیا ہے۔ آج بھی کھڑی بولی کے علاقے میں برج بھاشا کی مکرنیاں اور پہیلیاں عام طور سے مروج ہیں۔ چنانچہ خسرو کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس میں دو قسم کی زبان ملتی ہے۔ ٹھیٹھ کھڑی بولی، جو اکثر پہیلیوں، مکرنیوں اور دوسخنوں میں ملتی ہے اور گیتوں کی زبان جو عام فہم برج بھاشا میں ہیں۔ اس سے خسرو کو کبیر کی طرح مفر نہ تھا۔ مثالیں:۔

(۱)

ایک تھال موتی سے بھرا ۔۔۔ سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے ۔۔۔ موتی اس سے ایک نہ گرے

(۲)

ایک کہانی میں کہوں تو سُن لے میرے پوت　　بنا پروں وہ اُڑ گیا باندھ گلے میں سوت

(۳)

بات کی بات ٹھٹھول کی ٹھٹھول　　مرد کی گانٹھ عورت نے کھول

---

(۴)

ایک نار ترور سے اُتری ماں سے جنم نہ پایو
باپ کا ناؤں جو وا سے پوچھیو آدھو ناؤں بتایو
آدھو ناؤں بتایو خسرو کون دیس کی بولی
وا کو ناؤں جو پوچھیو میں نے اپنی ناؤں نہ بولی

(۵)

ایک گنی نے یہ گن کینا ہریل پنجرے میں دیدینا
دیکھو جادو گر کا کمال ڈالے ہرا نکالے لال

ان پہیلیوں میں نمبر ۱ سے نمبر ۳ تک ٹھیٹھ کھڑی میں ہیں۔ نمبر ۴ برج بھاشا میں اور نمبر ۵ میں دونوں بولیوں کی ملاوٹ ہے۔ ان سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک دو سگی بہنوں کی حیثیت سے برج اور کھڑی کا جھگڑا ابھی تک نہیں اٹھا تھا۔ البتہ برج ادبی زبان ہونے کی حیثیت سے زیادہ شائستہ سمجھی جاتی تھی۔ دراصل خسرو کے یہاں ہمیں سب سے پہلے زبان کا وہ ڈھانچہ ملتا ہے جو

آج اپنی تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔

نامدیو۔ کبیر اور نانک:۔ اسی عہد کے (چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی) دوسرے شاعر نامدیو، کبیر اور نانک ہیں۔ مسلمانوں کے لشکروں کے ساتھ دلی اور اس کے نواح کی بولی پورب پچھم اور دکنی ہندوستان میں پھیل جاتی ہے۔ اس زبان کی شکل نامدیو (مرہٹی شاعر سنہ ۱۳۲۸ء وسنہ ۱۴۵۸ء) کے یہاں دیکھئے۔

مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہاں سے آیا
چندر نہ ہوتا، سورج نہ ہوتا، پانی پون ملایا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں سے آیا

اس کھڑی بولی کا روپ کبیر (پندرھویں صدی عیسوی) اور گرو نانک (پندرھویں صدی عیسوی) کے یہاں دیکھئے۔ ایک پورب (بنارس) کا رہنے والا ہے اور دوسرا پنجاب کا۔

کبیر کہتا جات ہوں سنتا ہے سب کوئی
رام کہے بھلا ہوگا، نہیں تو بھلا نہ ہوئی
آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوں گا
گرو کے سبد رم رم رہوں گا

نانک:۔ اس دم دا میں نوں کیہ بھروسہ، آیا آیا نہ آیا آیا

یہ سنسار رین دا سپنا، کہیں دیکھا کہیں نا ہیں دکھایا
سوچ وچار کرے مت من میں جس نے ڈھونڈا اس نے پایا
نانک بھگتن دے پد پرسے نس دن رام چرن چت لایا

راسو، خسرو، نامدیو، کبیر اور نانک کے اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ برج، کھڑی اور ہریانی ان سب بولیوں کے بیج اس وقت کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ برج کو اس وقت ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ رفتہ رفتہ شورسینی زبان کی وہ روایات غالب آجاتی ہیں۔ جن کا تعلق کھڑی بولی اور ہریانی سے تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے دلی اس وقت دارالسلطنت تھی جو کہ ان بولیوں کے علاقے میں ہے۔ ابتدا میں کھڑی بولی برج بھاشا کی گود میں نظر آتی ہے۔ بعد کو خاص طور سے مسلمان صوفیاء کی سرپرستی میں یہ ایک علیحدہ ادبی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دراصل مسلمانوں کے داخلہ دلی کی تاریخ جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مشرقی پنجاب نواح دلی اور دوآبہ کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ اس علاقے کی زبانیں اس وقت ارتقائی منزلوں سے گذر رہی تھیں جن کا مکمل نکھار ہم کئی صدیوں کے بعد پاتے ہیں اسی خام حالت میں مسلمان لشکری اس کو دکن لے کر گئے؟ جہاں وہ زبانوں کے اجنبی ماحول میں ارتقائی منزلیں طے نہ کر سکی؟

دلی کی قدیم زبان اور دکنی میں زیادہ فرق نہ تھا۔ لیکن شمال میں لسانی تبدیلیوں کی رفتار تیز رہی۔ چنانچہ جب ولی اپنی دکنی بولتے ہوئے دلی میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں ایک ترقی یافتہ زبان سے سابقہ پڑتا ہے۔ جس کی شہادت خود اُن کے دیوان سے ملتی ہے۔ سن ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء چار سو سال میں دکن میں اُردو کا ارتقا جس انداز پر ہوا اس کا اندازہ دکنی ادب کے اُن وافر نمونوں سے کیا جا سکتا ہے جو اس صدی میں محققین کی کوششوں سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے دکنی کا علاقہ، مہاراشٹر، ریاست حیدرآباد۔ ریاست میسور، آندھرا اور تامل ناڈ کے بعض اضلاع پر مشتمل ہے۔

ان علاقوں میں مرہٹی، تلنگی، کنڑی اور تامل زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مرہٹی کے علاوہ باقی سب زبانوں کا تعلق دراویدی خاندان السنہ سے ہے۔ اس لئے دہلی کی زبان دکن پہونچ کر زبانوں کے اجنبی ماحول ایک علیحدہ ڈگر پر بنتی رہی۔ دکن میں "زبان دہلوی" کا پہلا مرکز دولت آباد تھا۔ جو مرہٹی کے علاقے میں ہے۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ دکنی کا مرکز کنڑی کے علاقے میں گلبرگہ منتقل ہو جاتا ہے سلطنت بہمنیہ کے جب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں

تو دکنی کے دو نئے مرکز پیدا ہو جاتے ہیں۔ تلنگی کے علاقے میں گولکنڈہ (حیدر آباد) اور کنڑی کے علاقے میں بیجاپور۔ دکنی ادب انھیں دونوں دبستانوں میں اپنے کمال کو پہونچتا ہے۔ اور دہلی کی خام زبان قلی قطب شاہ، وجہی اور نصرتی کے ہاتھوں میں ادبی سطح تک پہونچتی ہے۔ دہلی کی قدیم زبان کا رخ دکنی کے آئینے سے جھلکتا ہے۔ ولی سے پہلے دکنی کی شکل ہمیں ذیل کے اقتباسات میں نظر آ جائے گی:-

رہیا شہ اسی نار کے دھیان میں ۔۔۔ نہ بھیں پردسے وہ نہ آسمان میں
کھیا جائے نا بات دو بات موں ۔۔۔ لگیا تلملانے بہوت دھات سوں

(وجہی: قطب مشتری)

پیا باج پیالا پیا جائے نا ۔۔۔ پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند ۔۔۔ دوانے کو کچ پند دیا جائے نا

(دیوان قلی قطب شاہ)

شمال میں اسی زمانے کے ایک شاعر افضل (۱۶۱۲ء) کے بارہ ماسہ کی زبان دیکھئے اور اس کے ارتقا کا اندازہ کیجئے۔

سکھی رے جیٹ رت آئی سوائی ۔۔۔ اجھوں اسید میری بر نہ آئی
رہے ہیں جو نرے جیو لوگ گلے لاگ ۔۔۔ مرے سینے جدائی کی لگی آگ
سکھی دن رین مجھ ناگن ڈست ہے ۔۔۔ پھروں دوری تمامی جگ ہست ہے

دکن اور شمالی ہند کے لسانی اختلافات کی بہترین عکاسی ہمیں ولی کے دیوان میں ملتی ہے۔ دکنی کے توسط سے اپ بھرنش کی قدیم روایات سے وابستگی اور لسانی تبدیلیوں کا احساس دونوں پہلو بہ پہلو جھلکتے ہیں۔ یہی نہیں ہندی اور فارسی الفاظ کی آمیزش میں بھی دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ ولی کی زبان میں جو پرانا پن جھلکتا تھا اس کے خلاف بالآخر اصلاح زبان کی تحریک دلی میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اردو کی یہ آخری اور ترقی یافتہ شکل متعین کرنے میں برج نے کافی حصہ لیا۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے۔ کہ آگرہ عرصہ تک مغلوں کا دارالسلطنت رہا۔ اور آگرہ کی زبان معیاری سمجھی جاتی تھی۔ شاہجہاں کی مراجعت دہلی (۱۶۴۸ء) سے "زبان دہلوی" کا نشاۃ الثانیہ شروع ہوتا ہے جس کی تکمیل اورنگ زیب کے عہد میں ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کے آخری دور میں اورنگ آباد اور دہلی کے درمیان لسانیاتی رشتے بہت گہرے ہوجاتے ہیں۔ غرض کہ اٹھارویں صدی کے آغاز تک زبان دہلوی نے ایک طرف برج کو زبان کے اکھاڑے سے نکال باہر کیا اور دوسری طرف بدیسی فارسی کو پچھاڑ لیا۔ سترھویں صدی کے اواخر ہی میں فارسی کے ہندوستانی شعرا کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ "ریختہ" کا ارتقا ادبی سطح تک ہوچکا ہے اور اس کے ادبی استعمال کو اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی زمانہ ہے جب ہریانے کے علاقے میں

درس وتدریس کی ضروریات کے تحت منظوم لغات لکھی جانے لگیں۔ میر عبدالواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات ہندی" جو اُردو کی پہلی لغت ہے "فائدہ عام" کو پیش نظر رکھ کر لکھی۔ "فائدہ عام" کا یہ تصور شہر دہلی نہیں بلکہ مضافات دہلی میں پہلے پیدا ہوا۔ شہر دہلی میں اُردو کی طرف لوگوں کی توجہ سنجیدگی کے ساتھ اس وقت منعطف ہوئی جب "باشندگان دکن" جوق درجوق اپنے ادبی سرمائے کو لے کر دہلی پہنچے۔ نواب صدرالدین محمد خاں فائز نے اپنا اُردو دیوان ۱۷۱۵ء میں مرتب کیا۔ فائز کے کلام سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ دہلی کی زبان اور انداز بیان پر دلی کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ لیکن جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے بہت جلد دہلی والوں کے یہاں دکنی زبان کے خلاف ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ اسی تحریک کی قیادت مرزا مظہر جانجاناں کو حاصل تھی جو اس وقت دہلی کی ادبی اور روحانی تحریکوں کی جان تھے۔ چنانچہ حاتم نے جب ۱۷۵۵ء میں اپنی قدیم کلیات سے رطب ویابس نکال کر "دیوان زادہ" مرتب کیا تو اصلاح ومعیار زبان کا بقول شاہ مبارک آبرو انہوں نے ان اصولوں کو پیش نظر رکھا۔

(۱) وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
اون سیتی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے ریختے میں حرف ہے

(۲) وہ عربی فارسی الفاظ استعمال کئے جائیں جو "قریب الفہم وکثیرالاستعمال ہوں"

(۳) دہلی کا وہ روزمرہ استعمال کیا جائے جو فصیحوں کو منظور ہو۔
(۴) مختلف بولیوں کے وہ الفاظ جو "بھاکا" کے ہوں متروک
(۵) صرف وہ روزمرہ جو "عام فہم" مگر "خاص پسند" ہو۔

چنانچہ ان اصولوں کے تحت تسبی پر تسبیح، صحی پر صحیح، بگانہ پر بیگانہ، مَرَض پر مَرْض کو تسلیم کیا گیا۔ "نین و جگ و نت و دلبر" جیسے الفاظ متروک قرار دئے گئے۔ بھاکا کے الفاظ کی بجائے عربی فارسی لفظ کھپائے گئے۔ مثلاً نین کی بجائے چشم، ساجن کی بجائے معشوق، درشن کی بجائے زیارت، موہن کی بجائے معشوق، پیو کی بجائے دوست اور یار، برہا کی بجائے فراق وغیرہ۔

میر و مرزا کی زبان میں ہندی کے متروک الفاظ اور دکنی زبان کے افعال کے جو پیوند نظر آتے ہیں ان کی صفائی بالآخر لکھنؤ جاکر ناسخ کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی اردو باعتبار صوتیات اور گرامر کی بعض خصوصیات کے اودھی زبان سے متاثر نظر آتی ہے۔ دہلی والوں کو لکھنوی لہجہ اسی وجہ سے زنانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو ایک مردانہ زبان ہے اور اس کی صوتیات کا معیار لکھنوی لہجہ سے نہیں بلکہ دلی اور اس کے نواح میں رہنے والوں کی صوتیات سے متعین ہوگا۔ یہ کھڑا لہجہ ہے جس کے صحیح تصور کے لئے برج اور اودھی بولیوں کا پس منظر ضروری ہے۔ لیکن یہ ذہن میں

رہے کہ یہ پنجابی کا کھڑا لہجہ بھی نہیں۔ اس اعتبار سے اُردو مین بین ڈولتی ہے۔ اس میں آیاں جائیاں۔ لٹا۔ بدلی اور گڈی کی تاب نہیں لیکن یہ جیکھا۔ رکھا۔ بٹھانا اور بنھانا کی ابھی تک کی متحمل ہے۔ اور اہلِ لکھنؤ کی مخالفت کے باوجود آئے ہے، جائے ہے کی ردیف میں اب بھی شعر گوئی ہوتی ہے۔

اُردو کا صرفی اور نحوی ارتقا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس کی صوتیات اور لہجہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ متعین ہو چکا ہے۔ لیکن اُردو کا مرکز اب لکھنؤ نہیں رہا۔ دلّی بھی شاید نہیں رہے گا۔ کیا لاہور اور کراچی کے لہجہ میں اس زبان کی تکمیل ہوگی؟



اُردو کی چند مفید کتابیں

یہ کتب خانہ عرصہ دراز سے علی گڑھ میں قایم ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ اُردو (ابتدائی، ادیب، ماہر و کامل) کی جملہ کتب، NOTES اور سلیبس (SYLLABUS) وغیرہ سب ہمارے یہاں ملتے ہیں

بچوں کی تربیت	۸/عہ
علم خانہ داری (ترمیم شدہ)	۶/عہ
رہبر تندرستی (ترمیم شدہ)	۵/عہ
زنانہ دستکاری	۲۵/عہ
تعلیمی نفسیات	۲۵/عہ
گلدستۂ مضامین و انشاپردازی (ترمیم شدہ)	۶/عہ
اُردو زبان کی تاریخ کا خاکہ (ترمیم شدہ)	۱۰/-
اُردو زبان اور ادب (ترمیم شدہ)	۱۲/عہ
تحقیقی مطالعۂ حالی	۱۲/عہ
تحقیقی مطالعۂ شبلی	۱۲/عہ
تحقیقی مطالعۂ انیس	۱۲/عہ
گلزارِ نسیم مع تنقید و تبصرہ	۱۲/عہ
مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی	۶/عہ
مجموعۂ نظم حالی مع تبصرہ و نوٹ وغیرہ	۱۲/عہ
نقوشِ ادب	۱۲/عہ
شرحِ نقوشِ ادب	۱۲/عہ
خضرِ راہ مع تنقید و تبصرہ	۱۲/-
ابتدائی اُردو نصاب	۱۲/عہ
دہلی کا ایک یادگار شاہی مشاعرہ (بعہد بہادر شاہ ظفر)	۱۲/عہ
لکھنؤ کا ایک یادگار شاہی مشاعرہ (بعہد واجد علی شاہ اختر)	/عہ
بزمِ آخر	
(یعنی آگرہ سنہ ۱۸۴۳ء اور سنہ ۱۸۶۲ء کی ادبی صحبت جس میں غالب نے شرکت کی)	/۱۰
تاریخ و تہذیبِ عالم (بشکل سوالات و جوابات)	۱۵/عہ